تاثرات

ایک دَور کا خاتمہ

یہ صرف شاعری نہیں ایک حقیقت اور بیانِ واقعہ ہے:

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

میاں صاحب سے جب وہ ڈائرکٹر ہو کر ادارے میں تشریف لائے کچھ روز تک تو کچھ خلیج سی حائل رہی اس کے بعد محبت ہی محبت ملی ـــــ بے پناہ محبت، بے پناہ شفقت میری کچھ فطرت ایسی ہے کہ ہر چیز بھول سکتا ہوں، نہیں بھول سکتا تو تہمہ بھر خلوص اور شفقت کا مظاہرہ جس کا کبھی کسی طرف سے مظاہرہ ہوا ہو۔ میاں صاحب کی شفقت اور محبت سے تو تقریباً سات سال تک بہرہ ور ہوتا رہا، انھیں کیسے بھلا دوں؟ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے یہ میرا ذاتی حادثہ ہے اور میں خود تعزیت کا مستحق ہوں۔

جب تک میاں صاحب زندہ تھے میں اپنے اظہارِ وفا میں بخیل تھا کہ اسے تملق پر محمول نہ کیا جائے۔ لیکن اب کہ مجھے ان سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ نقصان۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ ان کے وجود کو ادارے کے لیے، اور اپنے لیے ہمیشہ سایۂ رحمت سمجھتا رہا، وہ جب کبھی بیمار پڑے، میں نے ہر نماز اور تلاوت کے بعد ان کے لیے دعائے صحت کی۔ یہ دعا ہمیشہ قبول ہوئی، لیکن اس دن قبول نہ ہو سکی جب وقت موعود آچکا تھا۔

یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اور ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ کتنے چاؤ اور شوق سے

اس رسالے کی ادارت انھوں نے مجھے سونپی تھی اور کتنے تامل اور تذبذب کے بعد یہ ذمے داری میں نے ان کی حوصلہ افزائی اور یقین دہانیوں کے بعد قبول کی تھی، آج وہ ساری باتیں خواب و خیال بن چکی ہیں۔ خود میاں صاحب افسانۂ ماضی بن چکے ہیں۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا ــــــ

لگاتار سات سال تک میاں صاحب نے اس ادارے کی خدمت کی، کمسن سالی ہجوم امراض اور ضعف و نقاہت کے باوجود جس پابندیٔ وقت کے ساتھ وہ ادارے میں آتے اور آخر وقت تک بیٹھتے۔ ایک ایک کاغذ کا مطالعہ کرتے، اور تمام ذمے داریوں کو سرانجام دیتے رہے، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، اور یہ دیکھ کر تو حیرت اور بڑھ گئی جب اس دیرینہ سال شخص نے جوانوں کے عزم اور ولولے کے ساتھ ادارے کی ایک پوری منزل مزدوروں، ٹھیکیداروں اور کارکنوں میں دن رات ایک کر کے، بہت ہی قلیل مدت میں تعمیر کر دی۔ وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے پھر اسی کے ہو رہتے تھے، اور جب تک وہ اتمام کو نہیں پہنچ جاتا تھا انھیں قرار نہیں آتا تھا۔

میاں صاحب فرشتہ نہیں تھے، بشر تھے ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہوں گی، اور لغزشیں بھی ہوئیں، لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ جس آزادیٔ فکر کو وہ اپنے لیے جائز سمجھتے تھے اس سے کسی کو محروم کرنے کا خیال تک ان کے دل میں کبھی نہیں آیا۔ چائے کے بعد نشست ہوتی تھی اور مختلف عنوانات پر بحث و گفتگو کا سلسلہ چل پڑتا تھا، جس جوش و خروش سے وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تھے، اسی تحمل اور بردباری سے دوسرے کی باتیں بھی سنتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ صرف انہی کی بات مانی گئی ہو۔ ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے دوسرے کی بات مان لی، اتنی خندہ جبینی اور وسعت قلب کے ساتھ جیسے یہ بات دوسرے کی نہیں خود انہی کی تھی۔

اپنے دور میں میاں صاحب نے رفقائے ادارہ کے مشورے سے تصنیف و تالیف کا نیا پروگرام بنایا، نئے اصول و ضوابط مقرر کیے، نیا اسلوب اور منہاج وضع کیا اور کوشش

کی کہ اس ڈگر سے ادارہ ہٹنے نہ پائے۔ وہ فلسفہ کے ماہر خصوصی تھے لیکن اسلام کے رمز آشنا بھی تھے، اور اسلامی احکام و تعلیمات پر عمل بھی کرتے تھے۔ کئی مرتبہ میں نے انھیں جماعت میں اور انفرادی طور پر نماز پڑھتے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے انھیں والہانہ شیفتگی تھی۔ نعت سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے اور بڑے شوق کے ساتھ اقبال کا، اور بعض دوسرے شعرا کا نعتیہ کلام سنا کرتے تھے۔ اس وقت ان پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی اسے الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔

دفتر کے بعض لوگوں پر کبھی کبھی وہ خفا بھی ہو لیتے تھے۔ لیکن ان کی خفگی دیرپا نہیں تھی۔ کسی سے وہ کتنے ہی بیزار اور غیر مطمئن ہوں، لیکن اسے نقصان پہنچانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اگر ان کو اس طرح کی رائے دی جاتی تو بھی بہ انداز شائستہ ٹال جاتے، اور جہاں تک فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے، جائز حدود کے اندر رہ کر کسی کو بھی فائدہ پہنچانے سے انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ بعض ایسے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا جو ان کے پیش رو کے زمانے سے شکوہ سنج محرومی چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے صورت احوال کو پورے طور پر محسوس کرتے ہی اقدام کیا، اور جو چیز ناممکن نظر آتی تھی وہ امر واقعہ بن گئی۔

اصول کے معاملے میں بے شک بے لچک تھے لیکن ان کا کوئی اصول ایسا نہیں تھا جسے کسی اعتبار سے بھی سخت، ناروا یا نامناسب کہا جا سکے۔ اور اس معاملے میں بھی امکانی حد تک مراعات دیتے رہتے تھے۔

اب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی یادگار میں یہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔ جو مضامین حاصل ہو سکے حاضر ہیں۔ اس موقع پر یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ ان کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں، نیازمندوں اور رفیقوں سے میں نے اس سلسلے میں بار بار التجائیں کیں کہ وہ اپنے ذاتی تاثرات و مشاہدات قلمبند کر کے مرحمت فرما دیں، لیکن میری آواز کچھ اتنی بے اثر تھی کہ کامیاب نہ ہو سکی۔

کتنی عبرت کا مقام ہے کہ جس شخص کی زندگی میں ہم اسے پیار کریں، اس کی قدر کریں، اس کی عظمت کے ثنا خواں ہوں، اس کی سیرت اور کردار کی تعریف میں رطب اللسان ہوں، اس دنیا سے گزر جانے کے بعد اس کی یاد صرف ہمارے دل کے نشیمن میں موجود رہے، نوک قلم اور صفحہ قرطاس پر منتقل نہ ہو سکے۔

اس سلسلے میں دو ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں،

جسٹس ایس۔ اے رحمٰن سے میں نے ایک مضمون کی استدعا کی، چند ہی روز کے بعد ایک دوسرے مسئلے سے متعلق گفتگو کرنے ان کے در دولت پر حاضر ہوا تو ان کا مضمون تیار تھا۔ فوراً بغیر کسی مزید تقاضے اور یاد دہانی کے بغیر انھوں نے مرحمت فرما دیا۔

اسی طرح سید الطاف علی بریلوی ایڈیٹر "العلم" کراچی کو، ادھر میں نے خط لکھا، ادھر ان کا مقالہ پہنچ گیا۔

یہ نمبر اتنا جامع اور مکمل نہیں ہے جتنا میں چاہتا تھا، لیکن بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس وقت اتنا ہی ممکن تھا۔ اگر حالات سازگار رہے اور وعدہ کرنے والے حضرات نے اپنے وعدوں کا ایفا کیا تو کچھ عرصے کے بعد "ثقافت" کی ایک اور اشاعت بھی میاں صاحب کے لیے وقف کی جا سکتی ہے لیکن اس کے انتظار میں وہ مواد جو حاصل ہو چکا تھا معرض التوا ر میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

رئیس احمد جعفری